دعوت عام کی بنیادیں

خرم مرادؒ

عوام کو منظم کرنے اور اپنے ساتھ لے کر چلنے کی جو تدبیر ہم نے اختیار کی ہے' یہ اسی حکمت عملی کا تسلسل ہے جو سارے انبیاکرام نے اختیار کی۔ جماعت اسلامی نے شروع ہی میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ بالآخر ہمیں رائے عامہ سے' عوام کی تحریک سے' اور عوام کی قوت کو جمع کر کے یہ تبدیلی لانا ہے۔ دوسرے ذرائع خواہ وہ اسلحہ ہو یا مظاہرے یا اس قسم کی دیگر تدابیر' اپنے استعمال کے لیے بہت سی شرائط کے طالب ہیں۔ لیکن تبلیغ اور دعوت سے رائے عامہ کو ہموار کرنا' قوت بنانا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر چلنا' یہ انبیاے کرام کی ابتدا ہی سے حکمت عملی رہی ہے اور یہی جماعت اسلامی نے طے کیا تھا۔ اگرچہ اس پر عمل درآمد کی صورتیں حالات کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔

عامتہ الناس کو منظم کر کے اپنے ساتھ لے کر چلنا' بہت پرخطر کام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دین اور ایمان کے لیے جتنا خطرہ اس میں ہے' اتنا کسی اور کام میں نہیں۔ اسی لیے بہت سے لوگ جن بے شمار خدشات اور اندیشوں کا اظہار کرتے ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہیں' وہ واقعی خطرے ہیں اور اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں۔ ان خطرات و خدشات کی طرف انبیا نے بھی ابتدا ہی سے توجہ دلائی ہے۔ ملت اسلامیہ کے صلحا' علما اور دیگر اکابر بھی اس طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ یہ بڑا پُرخطر کام ہے۔ اس کے اندر نفس کے لیے' دین کے لیے اور ایمان کے لیے جو خطرات پوشیدہ ہیں وہ بہت بڑے خطرات ہیں۔ نفس کے لیے مال سے بڑھ کر فتنہ جان کا ہوتا ہے۔ طلب اور شہرت کی خواہش' دو انسان کسی کے پیچھے چلنے لگیں تو کبر کا جذبہ' اور اپنی ذات کے لیے کچھ حاصل کرنے کا جذبہ' بڑی آسانی کے ساتھ شیطان دلوں کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک لاکھ روپے جمع کرنے سے آدمی کو وہ خوشی اور افتخار حاصل نہیں ہوتا جو لوگوں کے دل کو موہ لینے اور افراد کو اپنے ساتھ لے کر چلنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب دو آدمی کہنا ماننے لگیں تو اس سے آدمی کو اپنے مقام کا احساس ہوتا ہے' اور اس مقام و مرتبہ کے لیے اس دنیا میں کیا کچھ جھگڑے نہیں ہوتے۔ لوگ ہمارے پیچھے چلیں اور ہمارے ساتھ ہوں' پیروں میں' علما میں اور سیاسی لیڈروں میں' ہر جگہ یہ

خواہش سب سے بڑی ہوتی ہے۔ اسی لیے انبیا کا طریقہ کار بڑا پُرخطر اور پُرعزم طریقہ کار ہے۔

تصوف اور وظائف کا طریقہ تو نسبتاً آسان طریقہ ہے کہ آدمی ایک گوشے میں بیٹھ جائے، توجہ حاصل کرلے اور اذکار میں مشغول ہو جائے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، اللہ کا قرب حاصل کرے اور اس کی ذات میں فنا ہو جائے۔ لیکن اللہ کی ذات سے ربط قائم کر کے، اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کے، "اعتصام باللہ" کے ساتھ آدمی عوام اور مخلوق خدا کی طرف رخ کرے، ان کو اپنے مقصد اور نظریے کے پیچھے جمع کرے اور ان کی قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس کو استعمال کر کے تاریخ کا رخ بدل ڈالے، یہ کام بڑے عزم و حوصلے اور صبر و محنت کا طالب ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ نہیں، یہ صبر اور محنت سے فرار کی راہ ہے تو وہ نہیں سمجھتے کہ دراصل کیا چیز پیش نظر ہے۔ یہ انبیا کی راہ ہے، بڑے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کی راہ ہے۔

ہمارا سارا لٹریچر جو تزکیۂ نفس کے موضوع پر پایا جاتا ہے، اس میں دو چیزوں یعنی "طریقہ ولایت" اور "طریقہ نبوت" کا ذکر آیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ نے بھی اپنی تصانیف میں ان کا ذکر کیا ہے۔ "طریقہ ولایت" یہ ہے کہ آدمی اپنا تزکیہ کرلے اور کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کرلے۔ "طریقہ نبوت" یہ ہے کہ آدمی مخلوق خدا کے ساتھ رہے اور اس کی اصلاح کرے۔ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ آدمی کسی گوشے میں بیٹھ رہے، خوب عبادت کرے اور اللہ کی ساری نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ بلاشبہ دین میں "طریقہ ولایت" کا اپنا ایک مقام ہے اور یہ بھی بڑی ہمت کا کام ہے لیکن لوگوں میں رچ بس کر رہنا اور پھر اصلاح کی کوشش کرنا، یعنی "طریقہ نبوت" اپنانا، بڑا کٹھن کام ہے۔

علامہ اقبالؒ ایک جگہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ جو بہت عظیم صوفیا میں سے تھے، انھوں نے کہا کہ محمد عربیؐ ساتویں آسمان پر اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گئے اور واپس آگئے۔ اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ یہ لکھ کر علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ نبوت کے مزاج اور تصوف کے مزاج میں دراصل یہی فرق ہے۔ تصوف کا تو منتہا ہی یہی ہے کہ وہ حق میں فنا ہو جائے، اور حق کو پا کر اسی میں گم ہو جائے۔ لیکن نبی تو حق کو پا کر واپس آتا ہے اور تاریخ کے دھارے میں اپنے آپ کو جھونک دیتا ہے۔ تاریخ ساز قوتوں کو اپنی مٹھی میں لے کر پھر ایک نئی دنیا تشکیل دیتا ہے جس سے رہتی دنیا تک انسانیت فائدہ اٹھا سکے۔ یہی فرق ہے "طریقہ ولایت" اور "طریقہ نبوت" میں۔ لوگ اس کام کو آسان کام سمجھتے ہیں۔ یہ کوئی شارٹ کٹ یا اقتدار کی ہوس نہیں ہے بلکہ یہ کار انبیا ہے اور منصب نبوتؐ کا تقاضا ہے۔

دعوت کے اس کام کو کرنے کے لیے لوگ انبیا کے طریقہ کار کا نام بھی بار بار لیتے ہیں۔ انبیا کے طریقہ کار میں کچھ اصولی باتیں ہیں اور کچھ تدابیر۔ تدابیر مختلف انبیا کے ساتھ بدلتی رہی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نو سو سال تک پکارتے رہے: وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ (ھود ۱۱:۴۰) "اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے"۔ یہ دعوت عام کا ایک طریقہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نکلے تو اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ غلام تھے، ان کی ذہنیت اور نفسیات میں غلامی رچ بس چکی تھی۔ ان کا عقیدہ اور ایمان اس حد تک خراب تھا کہ فرعون سے نجات پاتے ہی یہ مطالبہ کر دیا کہ اے موسیٰؑ! پرستش و پوجا کے لیے ہمیں کوئی معبود بنا دیجیے۔ بات بات پر جھگڑتے اور اعتراض کرتے تھے اور یہ شکایت بھی کرتے تھے کہ ہم فرعون کے ساتھ بڑے آرام سے تھے۔ تم خواہ مخواہ ہم کو وہاں سے نکال لائے۔ یہ آزادی ہم کو نہیں بھاتی۔ دعوت کا یہ بھی ایک انداز تھا۔ حضرت مسیحؑ کا اپنا ایک انداز تھا اور نبی کریمؐ نے بھی دعوت کے لیے ایک حکمت عملی اپنائی۔

دعوت کے ان مختلف طریقوں میں کچھ چیزیں بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔ پہلے بھی یہ سامنے رہی ہیں مگر ان کی تذکیر ضروری ہے۔

اعتصام باللّٰہ

سب سے پہلی چیز "اعتصام باللہ" ہے۔ اس سے مراد اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا اور تھامنا ہے۔ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱) "جس نے اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اسی کو سیدھا راستہ دکھا دیا گیا"۔ صراط مستقیم پر چلنے کا دوسرا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ نے تم کو منتخب کیا ہے، اور ابراہیمؑ کی امت میں داخل کیا ہے اور امت مسلمہ تمھارا نام رکھا ہے، وہاں پہلی ہدایت یہی تھی: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط (الحج ۲۲: ۷۸) "اور اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو"۔ یہ وہ زاد راہ ہے کہ جس کے بغیر کوئی راستہ بھی طے نہیں ہوتا۔ تدابیر تو بہت سی اختیار کی جاسکتی ہیں لیکن اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔

اللہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے بھی کچھ طریقے ہیں۔ مثلاً اذکار و اوراد، نفلی عبادات اور انفاق وغیرہ۔ مگر اصل چیز تو اللہ پر بھروسا اور اللہ پر ایمان ہے۔ یہی اعتصام کے معنی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو آپ کے سامنے وضاحت سے بیان کروں۔ ان سب طریقوں میں سب سے بڑھ کر اسی زاد راہ کی ضرورت ہے۔

اصل چیز اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ یقین اور ایمان ہے کہ اس پوری کائنات میں اختیار اور تصرف اس کی مٹھی میں ہے اور کسی دوسرے کو شمہ برابر بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی پتا نہیں ہل سکتا اور نہ کوئی ذرہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے۔ جو پتا اس کی مرضی کے بغیر ہل جائے وہ تو خود خدا ہو جائے گا اور اس کی خدائی سے باہر نکل جائے گا۔ اجازت نہ ہو اور پتا ہل جائے، یہ اس کائنات میں

نہیں ہو سکتا۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ ۳۲: ۵) "آسمان سے زمین تک سارے امر کی تدبیر وہی کرتا ہے"۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (البقرہ ۲: ۲۵۵) "اسی کے لیے ہے ہر چیز جو آسمان اور زمین میں ہے"۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (التوبۃ ۹:۱۱۶) "اسی کی بادشاہت ہے آسمان و زمین میں"۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ (البقرہ ۲: ۲۵۵) "اسی کی کرسی کے نیچے آسمان و زمین ہیں"۔ "کرسی" کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اس کے اقتدار سے باہر نہیں۔

تاریخ کی کوئی کروٹ ہو، لیل و نہار کی کوئی گردش ہو، قوموں کا عروج و زوال ہو، اسمبلیوں کا ٹوٹنا اور بننا ہو، غرض کوئی چیز بھی اس کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت یہی توحید کی روح ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کو مان لیا کہ وہ ہے اور اس کے آگے سجدہ کر لیا۔ اس طرح سے اللہ کو ماننے والے تو بے شمار ہیں۔ ایک، مان لینا اور سجدہ کر لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل تو یہ تصور ہے کہ اختیار اس کے پاس ہے، حکم صرف اس کا چلتا ہے، دلوں کو کوئی نہیں بدل سکتا، نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کوئی کان سن سکتا ہے، اور نہ کوئی دل دھڑک سکتا ہے، غرض کوئی حرکت نہیں ہو سکتی، اگر اللہ نہ چاہے۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (یونس ۱۰:۳۱) "یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟" رات کو لمبی کر کے کون دن لا سکتا ہے اور دن کو لمبا کر کے کون رات لا سکتا ہے؟ کون پیدا کرتا ہے؟ کون آسمان سے پانی برساتا ہے؟ یہ سب باتیں قرآن مجید میں ایک تواتر سے آتی ہیں۔ یہی توحید کی روح ہے۔ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اختیار صرف اس کا ہے۔

دنیا میں خدا کا انکار تو شاذونادر ہی کیا گیا ہے۔ آج بھی ۹۳ فی صد امریکی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ۸۰ یا ۹۰ فی صد لوگ اللہ کو مانتے ہیں۔ جہاں بھی آپ چلے جائیں خواہ ہندو ہوں یا بدھ، سب کسی نہ کسی طرح سے خدا کو مانتے ہیں۔ لیکن خدا بااختیار ہے، یہ نہ ماننے کا چلن عام ہے۔ اسی لیے جہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کا ذکر کیا ہے، وہاں یہ فرمایا: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ (الاعراف ۷: ۵۴) "درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا"۔ اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ خالق کو ماننے والے تو سب ہیں کہ خالق ہے، لیکن یہ کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے، اقتدار اس کے پاس ہے، تخت حکومت پر وہ جلوہ افروز ہے، اور اس کی مٹھی میں ساری چیزیں ہیں، یہ بات ماننے والے بہت کم ہیں۔ اس سے صحیح معنوں میں خدا پر ایمان مکمل ہوتا ہے۔ ہر جگہ یہی سب سے بڑا مسئلہ رہا ہے۔

جدید دنیا کا بھی یہی مسئلہ رہا ہے۔ نیوٹن نے ایک سیب گرتے دیکھا۔ سیب کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا کہ دنیا میں سب چیزیں کشش ثقل پر تھمی ہوئی ہیں۔ نیوٹن بڑا پکا عیسائی بلکہ موحد (unitarian) تھا

اور عیسائیت میں موحد طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب اس نے کتاب لکھی تو اس کا خیال تھا کہ اس سے مذہب کو بڑی تقویت ملے گی۔ لیکن اس کتاب نے تو مذہب کی جڑ کاٹ دی۔ لوگوں نے اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ ہاں' خدا نے پیدا ضرور کیا ہے مگر اب وہ زمین و آسمان کو تھامے ہوئے نہیں ہے بلکہ اب یہ خود بخود قدرت کے قانون پر قائم ہے۔ چنانچہ گھڑی ساز خدا کا عقیدہ یورپ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں آیا۔ جس طرح گھڑی ساز گھڑی بناتا ہے اور گھڑی چلانے کے لیے گھڑی ساز کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے' اسی طرح خدا بھی ہر چیز سے بے دخل ہو گیا ہے' سیاست سے بھی' معیشت سے بھی' اور انسان کی تخلیق سے بھی۔ یہ چیز جہاں ہے وہاں بدترین سیکولرازم اور بدترین ثنویت ہے اور خدا کو بے اختیار اور بے دخل کر دیا گیا ہے۔ آج مادہ پرستی اور اسباب پرستی کا جو سیلاب ہے' اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ ہم سب اس سے متاثر ہیں۔

ہمیشہ سے انسان اس فکر سے متاثر رہا ہے۔ وہ اسباب کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ ایمان میں آزمایش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو پردے میں چھپا لیا ہے۔ وہ کچھ کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بارش آتی ہے' سب بتا سکتے ہیں کہ کس طرح بادل آئے' اور بارش ہوئی مگر کہیں خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زلزلہ آتا ہے' قومیں تباہ ہو جاتی ہیں مگر خدا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ انسان پیدا ہوتا ہے مگر خدا دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے پردے کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لیا ہے اور چھپا لیا ہے۔ اس پردے کو چیر کے دیکھ لینا کہ ہاں' وہ موجود ہے اور اس پر یقین رکھنا' یہی دراصل پوری ہدایت کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا آغاز کیا تو ہدایت کے بعد پہلی بات یہ کہی کہ یُؤمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرہ ۲: ۳) یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں وہی ہدایت پا سکتے ہیں۔ مگر آدمی مجبور نہیں' چاہے تو انکار کر سکتا ہے۔ یہ انسان کے امتحان کا تقاضا تھا۔

اگر خدا اس طرح روشن ہوتا جس طرح آسمان پر سورج' تو ہر آدمی مان لینے پر مجبور ہوتا۔ ماننے پر مجبور تو پہاڑ بھی ہیں اور چاند بھی' ستارے بھی ہیں اور فرشتے بھی' مگر انسان مجبور نہیں ہے۔ اس لیے کہ خدا اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ کہے کہ خدا نہیں ہے' خدا پانی نہیں برساتا' خدا پیدا نہیں کرتا' خدا رات اور دن کا مالک نہیں ہے' اس کا حکم نہیں چلتا' تو وہ کہہ سکتا ہے۔ کوئی عقل یا تجربہ ایسا نہیں ہے جو اس کو ثابت کر دے کہ خدا ہے۔ ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ثابت ہو جائے تو انسان کا امتحان ختم ہو جائے۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو ہماری اساس اور ایمان کی بنیاد ہے۔ یہ ایمان بالغیب ہے جس پر پورے دین کی عمارت تعمیر ہے۔ میں تفصیل میں اس لیے گیا ہوں کہ ہماری دعوت' ہمارے عزم اور ہماری قوت پر اس چیز کے بہت گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

انبیاے کرام علوم غیب پہنچانے آتے ہیں۔ ظاہری علوم مثلاً سائنس اور طب' یہ آدمی اپنی عقل سے خود جان سکتا ہے۔ لیکن وہ علوم جو انسان قطعیت کے ساتھ اپنی عقل سے نہیں پرکھ سکتا وہ ہیں جو انبیا پہنچاتے ہیں۔ اللہ موجود ہے' موت کے بعد اس کو جواب دینا ہے' گو کوئی چیز نگاہوں کے سامنے نہیں آتی لیکن اس پر یقین کہ ہر جگہ اسی کا ہاتھ کام کر رہا ہے' یہ دراصل توحید کی روح ہے۔ اسی وجہ سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کو عرش کے خزانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عرش تو مرکز سلطنت ہے اور عرش کے خزانوں میں یہی سب سے بڑا خزانہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے (مَا سَعٰی وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ) اور جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اس تصور کو ہر وقت تازہ رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً نماز ختم کرو تو اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا) پڑھو۔ حضورؐ ہر نماز کے بعد پڑھتے تھے۔ صبح اٹھنے کے بعد جو دعا آپؐ نے سکھائی ہے: مَا شَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَکُنْ (جو اللہ چاہے وہ ہو گا اور جو اللہ نہ چاہے وہ نہیں ہو گا)' اس میں بھی اسی بات کی تعلیم ہے۔ کل کے لیے یہ مت کہو کہ یہ ہو جائے گا بلکہ اِلاَّ اِنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر ہر قدم پر اسی چیز کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ کہیں بھی یہ سوچ جڑ نہ پکڑ سکے کہ اللہ کے چاہے بغیر بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

یہ دراصل ایمان بالغیب ہے۔ ایمان بالغیب میں تو اور بھی چیزیں ہیں مثلاً جنت اور دوزخ' لیکن میں یہ پہلو اس لیے لے رہا ہوں کہ یہ "اعتصام باللہ" ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو کہ ساری قوت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اسباب نظر آتے ہیں' "مسبب" اور رب نظر نہیں آتا' اس لیے آدمی سبب کو رب بنا لیتا ہے۔ کبھی چاند کے آگے جھکتا ہے اور کبھی ستارے کے آگے۔ کبھی گائے کے آگے جھکتا ہے جو دودھ دیتی ہے' مگر جس نے دودھ سینے میں اتارا اس کے آگے نہیں جھکتا کیونکہ وہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہم مختلف چیزوں کے مادی اسباب و علل پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ یہ یوں ہوا اور وہ یوں ہوا۔ بلاشبہ مادی اسباب کو ضرور سمجھنا چاہیے اور تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں لیکن بالآخر ذہن کو اس بات پر مطمئن ہونا چاہیے کہ اصل سبب تو رب ہے۔ وہی مسبب ہے' وہی رب العالمین ہے' وہی رَبّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے' اسی کے کرنے سے سب کچھ ہوتا ہے اور اس کے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ چیز جتنی زیادہ حاصل ہو گی اتنی ہی زیادہ قوت پیدا ہو گی۔ جتنا زیادہ اس بات پر پختہ یقین ہو گا' اتنا ہی زیادہ ایمان قوی اور راہ خدا میں استقامت پیدا ہو گی۔ اس کے بعد پھر خواہ کتنی ہی بڑی تعداد میں لوگ

تحریک میں شامل ہو جائیں آپ گمراہ نہیں ہوں گے۔ کتنے ہی لوگ آپ کی تعریف کریں' آپ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ کسی کی تعریف سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ (جس کو تو دے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو تو نہ دے کوئی دے نہیں سکتا)۔ کسی کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر کوئی چند دانے یا چند سکے بھی کسی کو دینا چاہے تو نہیں دے سکتا تو پھر کسی کی تعریف سے کیا فرق پڑے گا۔ ایسے میں آزمایشیں آئیں گی بھی تو تربیت کا ذریعہ بنیں گی اور مزید پختگی کا باعث ہوں گی' نیز لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی قوت بھی پیدا ہو گی۔

صحابہ کرامؓ میں یہی قوت تھی جس کے بل پر ساری سلطنتیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سب بڑے عبادت گزار اور تہجد گزار تھے۔ وہ تجارت کرتے تھے' کاروبار کرتے تھے' شادیاں کرتے تھے اور بال بچے دار تھے۔ ان کی زندگی دنیا والوں سے مختلف نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے فرائض کے پابند تھے' اور اس کے محرمات سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ انھیں اپنے اللہ پر کامل یقین تھا جس کے بل پہ وہ قیصر و کسریٰ تک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک اِن کی حیثیت پتلیوں اور مٹی کے گھروندوں سے زیادہ نہیں تھی۔ انھیں کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ بادشاہ کے دربار میں نیزے سے قالین کو چاک کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔ عرب کے ان بدووں اور معمولی انسانوں میں یہ قوت اس لیے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اللہ کی قوت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رب تو بس ایک ہے باقی سب اسباب ہیں' اور تمام اسباب اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ کام اسباب سے نہیں بنتا بلکہ رب کے چاہنے یا نہ چاہنے سے بنتا ہے۔

یہ وہ چیز ہے جو "اعتصام باللہ" میں پوشیدہ ہے۔ اس کو آپ جتنا حاصل کریں گے' اس پر جتنا آپ کا یقین بڑھے گا' یہ جتنا آپ کی گفتگو کا حصہ بنے گا' اتنا ہی مفید ہو گا اور تقویت ایمان کا باعث بنے گا۔ ماشاء اللہ' ان شاء اللہ' یہ سب جملے کیا ظاہر کرتے ہیں؟ یہ اسی چیز کی تائید میں ہیں اور ہماری تہذیب و تمدن اور سوچ و فکر میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں جزو کلام بن گئے ہیں مگر اب ہم ان کے معنی کھو چکے ہیں اور ان کا اثر بھی کھو چکا ہے۔

مائیں بچپن میں کہانیاں سناتی تھیں کہ ایک تھا بادشاہ اور ہمارا تمھارا خدا بادشاہ--- مسلمان بچوں کی کہانی یہاں سے ہی شروع ہوتی تھی۔ مجھے بھی یاد ہے کہ ہماری والدہ کہانی سناتی تھیں تو کہا کرتی تھیں کہ ہمارا تمھارا بادشاہ اللہ۔ بادشاہ تو بہت سے نظر آئیں گے مگر اصل بادشاہ تو اللہ ہے۔ اس کا مقصود یہ تصور تھا کہ بادشاہ کے معنی بااختیار ہستی کے ہیں۔ وہ صرف عبادت یا پرستش کے لیے نہیں ہے بلکہ اختیار' ملکیت'

ساری چیزیں وہی دیتا ہے۔

"اعتصام باللہ" کی تحریک کے لیے کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک میں کام کرنے کے لیے، کام کو آگے بڑھانے اور وسعت دینے کے لیے، اگلے مراحل میں لے جانے کے لیے، بڑی بڑی قوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے لیے، اور بلاخطر لوگوں کو اپنے پاس جمع کرنے، ان کی رہنمائی کرنے، اور اپنے آپ کو سارے فتنوں اور خطرات سے بچانے کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ فتنے تو پھر بھی ہوں گے مگر جب آدمی یہ سمجھ لے گا کہ میں بالکل اپنے رب کی مٹھی میں ہوں، میرے کرنے سے کچھ نہیں ہو گا، جو ہو گا اس کے کرنے سے ہو گا تو پھر وہ پریشان نہیں ہو گا اور حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار نہیں ہو گا۔

اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ نے اس کی بار بار تاکید کی ہے۔ غزوۂ بدر کی پہلی فتح ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً بتا دیا کہ تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا، اور تم نے مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ (الانفال ۸:۱۷) "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا"۔ گویا پہلے ہی قدم پر، پہلی فتح کے بعد بالکل واضح کر دیا کہ یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے کرنے سے کچھ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود اپنی تمام تر کوشش کرنے اور تمام ممکنہ وسائل کی فراہمی کا بھی حکم دیا کہ تلوار بھی اٹھاؤ، لڑو بھی اور تدبیر بھی کرو۔ صحابہ کرامؓ کو اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان پر واضح تھا کہ کرنا سب کچھ ہے لیکن سمجھنا یہی ہے کہ سب اللہ نے کیا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے کرنا ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال ہو۔ اللہ کی مدد حاصل ہو گی تو دنیا ہماری ہو گی۔ ان دونوں کے درمیان ایک باریک سا ربط ہے۔ سب کچھ ہو مگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

جب یہ ربط ذہن میں قائم ہو جائے تو پھر "اعتصام باللہ" کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ "اعتصام باللہ" ہی قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ پھر لوگ نعرے لگائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ جمع ہو جائیں تو آدمی نہیں بھاگتا۔ تعریف ہوتی ہے تو اس سے نفس میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا۔ لوگ حضورؐ کے سامنے آپؐ کا تھوک زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، آپؐ کے بال لے لیتے تھے اور انھیں سنبھال کر رکھتے تھے، وضو کا پانی لے کر منہ پر مل لیتے تھے مگر حضورؐ کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آپؐ بھی انسان تھے۔ سب کی طرح شیطان آپؐ کے ساتھ بھی لگا ہوا تھا، مگر آپؐ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی تائید سے ہوتا ہے، جو کچھ ملتا ہے اسی سے ملتا ہے، اور جو کچھ ہے اسے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دراصل "اعتصام باللہ" کے اندر یہ سوچ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعوت اور

تحریک کا کام کرتے ہوئے قوت کا یہ سرچشمہ جتنا زندہ رہے گا' جتنی زیادہ اس کو تقویت پہنچائی جائے گی' اتنا ہی خطرات سے بچ نکلنے کے امکانات بڑھتے جائیں گے۔ ان شاء اللہ!

یہ نہیں ہو گا تو ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھ کر بھی فتنے کے اندر مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک آدمی ہزاروں اشرفیوں میں کھیل رہا ہو' تخت شاہی پر بیٹھا ہو' اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے' سب اس کے کرنے سے ہوتا ہے' دل اسی سے لگا ہوا ہو' تو وہ ولی اللہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ایک فقیر جھونپڑی میں بیٹھا ہو' اس کے پاس دو پیسے ہوں مگر اسی میں دل اٹکا ہوا ہو' بار بار گنتا اور شمار کرتا ہو تو وہ دنیا پرست ہے۔ درحقیقت اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ آپس میں جمع ہیں یا نہیں ہیں' لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا نہیں رہتے ہیں' اچھا کھاتے ہیں یا نہیں کھاتے ہیں' فرق تو اس سے پڑتا ہے کہ دل کہاں اٹکا ہوا ہے' قوت کا منبع اور سرچشمہ کس کو سمجھتے ہیں؟ یہ دراصل "اعتصام باللہ" ہے۔

حنیفیت

"اعتصام باللہ" کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے "حنیفیت" کا مطالبہ کیا ہے۔ "حنیفیت" سے کیا مراد ہے؟ قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ بیسیوں جگہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کا حنیف کہا گیا ہے۔ دین کے لیے "حنیف" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ حنیف بن جاؤ۔ اسلام کے ابتدائی دور میں سود' شراب کی حرمت اور دیگر تفصیلی احکامات نہیں دیے گئے بلکہ سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا گیا تھا کہ اللہ کے لیے حنیف بن جاؤ۔ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (البینۃ ۹۸: ۵) "اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یک سو ہو کر"۔

یہ وہ بنیادی مطالبہ تھا جو مسلمانوں سے کیا گیا تھا۔ "حنیف" کا لفظ قرآن میں بار بار آتا ہے۔ "حنیف" کا ترجمہ ہمارے اردو مترجمین نے طرح طرح سے کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے یکسو ہو جانا اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ کا ہو رہنا۔ شاہ عبدالقادرؒ کا بڑا خوب صورت اور مختصر ترجمہ ہے کہ اللہ کے ہو رہو۔ گویا اللہ کے بن کے رہو' اسی کے بن جاؤ۔ اس میں ابھی عمل کا مطالبہ نہیں آتا۔ یہ تو پوری شخصیت' پوری ذہنیت اور بنیادی سوچ کی تعمیر کا عمل ہے۔

"حنیفیت" کا مطالبہ بار بار کیا گیا ہے۔ اللہ نے خود کہا ہے کہ سب سے آسان دین تو دین حنیف ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیمؑ کی مثال کو بطور خاص پیش کیا گیا ہے۔ مگر مقصود و مطلوب صرف اللہ کا ہو رہنا ہے۔ "حنیفیت" بھی "اعتصام باللہ" کے اندر شامل ہے۔ اس لیے کہ اللہ کو تو وہی بندہ قبول ہے جو پورے کا پورا اس کا ہو جائے۔ اس کے بعد گناہ' غلطیاں اور خامیاں ہونا' یہ کوئی بڑی

بات نہیں۔ انسان تو صفاتی مخلوق ہے۔ اگر وہ گناہ نہ کرتا تو اللہ کوئی دوسری ایسی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور گناہ سے دل شکستہ ہو کر اس کی بنتی، اسی کی ہو کر رہتی، اسی کی طرف رجوع کرتی اور اس کے در پر جا کر ہاتھ پھیلاتی۔ جو غلطیوں سے مبرا اور خطاؤں سے پاک ہیں اور ویسے ہی اس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں مثلاً، سورج، چاند، ستارے، فرشتے--- وہ اس کو اتنے محبوب نہیں ہیں۔ اس کو تو وہ محبوب ہے جو گناہ کر سکتا ہو اور نہ کرے، اور اگر گناہ ہو جائے تو اس کی طرف پلٹے، رجوع کرے اور توبہ کرے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آدمی صرف اس کا بن جائے اور اسی کا ہو رہے۔ جب ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا دنیا کی پوری عنان ان کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ درحقیقت وہ لوگ چاہییں جو صرف اسی کے بن جائیں اور اسی کے ہو رہیں۔

جب یہ دو چیزیں ذات کا حصہ بن جائیں اور تحریک کے کام میں شامل ہو جائیں تو پھر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ اگر منہ میں نوالہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے رکھ رہا ہے۔ اگر پانی ٹھنڈا ہے اور اسے پی رہا ہے تو وہ اسے پلا رہا ہے۔ اگر مرض سے صحت یابی ہو گئی تو ڈاکٹر کی دوا سے نہیں ہوئی بلکہ اس نے صحت دی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی چیز کا اعلان کیا تھا کہ وہی کھلاتا ہے، وہی پلاتا ہے اور بیمار پڑ جاؤں تو وہی شفا دیتا ہے۔ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ○ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ○ (الشعراء ۲۶: ۷۹-۸۰) "جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے"۔ اسی طرح اگر آنکھ دیکھتی ہے تو اس کے دکھانے سے دیکھتی ہے، کان سنتا ہے تو اس کے سنانے سے سنتا ہے، جیب میں پیسہ آتا ہے تو اس کے دینے سے آتا ہے۔ نیز یہ پہلو کہ وہ راستہ کیوں اختیار کیا جائے جو اسے ناپسند ہے، آنکھ وہ چیز کیوں دیکھے جسے وہ نہیں دکھانا چاہتا، اور وہ چیز کیوں نہ دیکھی جائے جس کو وہ چاہتا ہے کہ آنکھ اس پر جمی رہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر تمام تر اطاعت، محبت اور شکر کا انحصار ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق، تعلق باللہ سے ہے مگر یہ اس چیز کا سرچشمہ ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے، جو دے رہا ہے وہ دے رہا ہے، اور اگر کسی کا حکم چل رہا ہے تو اسی کا حکم چل رہا ہے۔ چونکہ سارے اسباب پردے میں ہیں اور نگاہ پردوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے، نتیجتاً آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

انبیا ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں اور غیب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ پھر آدمی پردے کے پیچھے بھی آج ہی وہ دیکھ لیتا ہے جو کل موت کے بعد نظر آئے گا۔ وہ آج ہی دیکھ لیتا ہے کہ ہاں، وہ ہستی وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ پانی بادلوں سے نہیں برس رہا، وہ برسا رہا ہے۔ کس نے کھیتی اگائی اور کس نے آسمانوں سے پانی اتارا، تم نے یا ہم نے؟ قرآن یہ سوال بار بار کرتا ہے تاکہ دل

کے اندر یہ بات جڑ پکڑ جائے کہ ظاہری اسباب کچھ بھی ہوں لیکن حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ اس سے محبت اور جذبہ شکر بھی پیدا ہو گا، اطاعت اور نافرمانی سے بھی آدمی بچے گا۔

قرآن نے ابتدا ہی سے ان دو چیزوں کی تاکید کی اور اسی پر اپنا پورا زور رکھا۔ جیسے جیسے یہ سوچ پختہ ہوتی گئی تو دیگر مطالبات پورے ہونے کی بنیاد بھی بنتی چلی گئی۔ اگر یہ پہلو کمزور ہو تو آدمی خواہ کتنے ہی اصول و ضوابط بنا لے، کتنے ہی احکامات جاری کر دے اور مطالبات پیش کر لے مگر وہ قوت پیدا نہیں ہو سکتی جس سے دنیا زیر نگیں ہو جائے۔ دنیا تو اس وقت زیر نگیں ہو گی جب آدمی اپنے خالق کا صحیح معنوں میں "حنیف" بن جائے۔ "حنیفیت" کی یہ صفت توحید سے حاصل ہو گی۔ لاحول ولا قوۃ، یہ عرش کا خزانہ ہے۔ پوری کائنات میں کوئی چیز اللہ کے دائرے سے باہر نہیں۔ اس کی "کرسی" میں زمین و آسمان سب سمائے ہوئے ہیں۔

اس پختہ سوچ، یقین اور تصور کے ساتھ جب آپ دعوت کا کام کریں گے، لوگوں کے پاس جائیں گے، دعوت دیں گے، ان کو جمع کریں گے تو نفس کے فتنوں، شہرت کی طلب، کبر اور دعوت کے دیگر خطرات سے آپ بڑی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔ اس بات کی ضمانت تو نہیں دی جا سکتی کہ شیطان وسوسے نہیں ڈالے گا اور دل میں وسوسے نہیں پیدا ہوں گے اور خیالات نہیں آئیں گے۔ اس بات کی کوئی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہ ایک لحاظ سے آزمایش کے لیے ضروری بھی ہیں، لیکن یہ کہ پھر آپ کی حیثیت ایک مضبوط قلعے کے اندر محفوظ فرد کی سی ہو گی اور اس کے اندر آپ فوراً بچاؤ کر لیں گے۔ پھر آپ آگے بڑھ کر بڑے بڑے خطرات مول لے سکیں گے، ان سے ڈر کے اور کانپ کے کسی گوشے میں نہیں بیٹھے رہیں گے۔ پھر آپ حضرت موسیٰؑ کی طرح رسی کے سانپ دیکھ کر نہیں ڈر جائیں گے، آپ کے پاس تو عصاے موسیٰؑ ہو گا، وہ اژدہا بن کر ان سارے وسوسوں اور خدشات و خطرات کو نگل جائے گا۔ پھر آپ اپنے مقام پر کھڑے ہو کر یہ سارا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایسی ہی عاجزی، تواضع و انکساری اور بندگی اور اعتصام باللہ و حنیفیت درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کی تاکید فرمائی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۳) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۰۱) جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

اللہ نے ہدایت کے لیے یومنون بالغیب (ایمان بالغیب) سے آغاز کیا اور قل ھو اللہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ کہو کہ اللہ ایک ہے، اس جیسا کوئی نہیں ہے، وہ بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ پھر سورہ

اخلاص کو بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے کہ اسے فجر کی نماز میں پڑھو' مغرب کی نماز میں سنتوں میں پڑھو' غرض سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کو پڑھنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے کہ ان دونوں کے اندر اسی چیز کی تعلیم موجود ہے۔ جو بھی اس کو جتنا سمجھے گا' حاصل کرے گا اور جذب کرے گا' اتنا ہی اس کے اندر قوت پیدا ہو گی۔ اس میں کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے' اپنے آپ کو تیار کرنے کی بات ہے۔ تیاری بھی کسی گوشے میں بیٹھ کر نہیں ہو گی بلکہ میدان میں اتر کر ہو گی۔ اگر آپ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں تو ان شاء اللہ ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔

دعوت عام' انقلاب اور تبدیلی کے حوالے سے ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہم کوئی شارٹ کٹ چاہتے ہیں یا جلدی مچا رہے ہیں۔ اس بات کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم کوئی شارٹ کٹ یا جلدی نہیں مچانا چاہتے۔ اس لیے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ جلد تبدیلی لانا چاہے گا تو کوئی شارٹ کٹ کی صورت پیدا کر دے گا اور اگر لانگ کٹ کرنا چاہے گا تو لانگ کٹ کر دے گا۔ یقیناً ہماری خواہش یہی ہے اور ہونی چاہیے کہ دین آج ہی نافذ ہو جائے لیکن اس کے لیے ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے' بغاوت نہیں کر سکتے۔ اگر دیر ہے تو انتظار کرنا ہو گا اور اگر اللہ کو جلد منظور ہوا تو خود کوئی راستہ نکال دے گا۔ تاہم دعوت کے لیے ہم ہر موثر ذریعہ اور طریقہ ضرور اپنائیں گے اور راضی بہ رضا رہیں گے۔

اگر ہم لوگوں کو اللہ کی طرف' اعتصام باللہ کی طرف اور حنیف بن کر حنیفیت کی طرف دعوت دیں تو پھر عوام کے دلوں کے راستے بھی کھلیں گے' ان کے اندر استعداد اور قوت بھی پیدا ہو گی اور وہ ساتھ بھی آئیں گے نیز ان خطرات سے بھی محفوظ رہیں گے جو خطرات "طریقۂ نبوت" میں ہیں اور جن سے بچنے کے لیے لوگوں نے "طریقۂ ولایت" اختیار کیا۔

بلاشبہ نبوت کا راستہ بڑا مشکل راستہ ہے کہ دنیا میں بھی رہو اور دنیا سے بے نیاز بھی رہو۔ اس سے مشکل آزمایش اور کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا سے کٹ کے آدمی دنیا سے بے نیاز ہو سکتا ہے مگر دنیا میں سر سے پاؤں تک غرق ہو اور پھر بھی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھے' اور اللہ کا ہو رہے' یہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب آدمی سارے اسباب کے پردے چاک کر دے' سبب کو رب نہ بنائے بلکہ اسی ایک کو رب بنائے جو ساری کائنات کا رب ہے۔ یہ وہ بنیادی سوچ اور فکر ہے جو اس راہ میں چلتے ہوئے ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ پہلے ہی قدم پر اس کو سمجھنا اور خوب جان کر آگے بڑھنا بہت ضروری ہے

(جاری) (کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)۔